AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

فقہ اسلامی میں استحسان: اصولی بنیادیں، فقہی مباحث اور معاصر اطلاقات کا تحقیقی جائزہ

ISTIHSAN AS A JURIDICAL PRINCIPLE IN ISLAMIC JURISPRUDENCE: DOCTRINAL BASIS, SCHOLARLY DEBATES, AND CONTEMPORARY HORIZONS

Muhammad Aqeel
Ph.D Scholar, Shaikh Zayed Islamic Centre,
Universitry of the Punjab, Lahore, Pakistan
Email: haqeelsharif313@gmail.com
Dr. Hafiz Abdul Basit Khan
Professor, Shaikh Zayed Islamic Centre,
Universitry of the Punjab, Lahore, Pakistan
Email: basit.szic@pu.edu.pk

Abstract

This article examines Istihsan as a juridical principle in Islamic jurisprudence, situating it within both classical scholarship and contemporary legal thought. The central research question guiding the inquiry is: To what extent can Istihsan be considered a legitimate and effective mode of legal reasoning across different historical and modern contexts?

Employing a qualitative methodology, the study draws upon primary texts of uṣūl al-fiqh, the juristic writings of the four Sunni schools, and contemporary Urdu fatwas. While the Qurʾān and Sunnah remain the undisputed primary sources of Islamic law, nearly eighteen secondary sources derive from them, among which Istihsan occupies a distinct and often contested place. The analysis highlights how the Ḥanafīs recognize Istihsan only when firmly anchored in a sharʿī proof, the Mālikīs regard it as a branch of maṣlaḥa mursala, whereas Imām al-Shāfiʿī explicitly rejected its validity, considering it a departure from rigorous legal reasoning.

Moving beyond theoretical debate, the article applies Istihsan to two modern issues: the substitution of endowed properties (istibdāl al-waqf) and the dissolution of marriage (tanṣīkh). These case studies, examined through both classical juristic formulations and contemporary fatwas, demonstrate the principle's enduring applicability.

The findings suggest that although Istihsan remains a point of divergence among the classical schools, it serves as a dynamic instrument capable of mediating between strict textual fidelity and the practical demands of evolving human circumstances. Properly employed, it reflects both continuity with tradition and adaptability to new challenges, thereby underscoring its relevance in contemporary Islamic legal discourse.

Keywords: *Istihsan; Islamic jurisprudence; uṣūl al-fiqh; substitution (istibdāl al-waqf); marriage dissolution (tanṣīkh);*

تمہید:

اسلام ایک مکمل، آفاقی اور عالم گیر دین ومذہب ہے، جو بلا تفریق تمام بنی نوعِ انسان کی رشد وہدایت اور کامیابی وکامرانی کا ضامن ہے۔ یہ اسلام کی ہی خوبی ہے کہ انسانی عقل وسوچ پر بے بنیاد اور غلط قسم کی روایات کے پردوں کو چاک کرتے ہوئے راہ حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام کی حقانیت وابدیت اور صداقت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اب تک کی معلوم دنیا میں جتنے بھی مسائل لوگوں کو پیش آئے ہیں خواہ ثقافت وتمدن کے تبدیل ہونے کی وجہ سے ہوں یا اسلوبِ معاشرت ومعاش کے تبدیل ہونے کی وجہ سے ہوں، فقہائے کرام نے ان پر کم از کم بحث ضرور کی ہے۔ یہ سب اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام تمام زمان ومکان کے انسانوں کے لئے قابل عمل اور لائق اتباع ہے۔

موجودہ دَور میں مادی ترقی اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کے مصادر کا مطالعہ اس انداز سے کیا جائے کہ درپیش مسائل کا حل آسان ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے انسانیت کے لئے جو جو آسانیاں اور سہولتیں رکھی ہیں شرعی حدود و قیود میں رہتے ہوئے ان سے پورا پورا استفادہ کیا جائے۔ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی مصادر کے بعد ثانوی مصادر میں سے ایک اہم اُصول "استحسان" ہے۔ جس کی مدد سے عصر حاضر کے کئی جدید مسائل کو حل کیا گیا ہے تاکہ شرعی حدود و قیود میں رہتے ہوئے امتِ مسلمہ سے مشقت، حرج، اور ضرر کو ختم کیا جائے۔ زیرِ نظر مضمون میں اسی بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ جدید مسائل کے حل میں کن علمائے کرام نے اس اُصول سے براہِ راست استفادہ کیا ہے؟ اور وہ کون سے علمائے کرام ہیں جنہوں نے اس کی بجائے کسی دوسرے اُصول سے استفادہ کیا ہے؟ چناں چہ سب سے پہلے اجمالی طور پر استحسان کا معنیٰ و مفہوم، اس کی اُصولی و فقہی حیثیت کو بیان کیا جائے گا اور آخر میں جدید مسائل کو اس کی روشنی میں حل کیا جائے گا۔

استحسان کا لغوی مفہوم:

لغوی اعتبار سے لفظ استحسان باب استفعال کا مصدر ہے جس کا معنیٰ و مفہوم کسی بھی چیز کو اچھا سمجھنا اور بہتر خیال کرنا یا کسی اچھی چیز کی تلاش و جستجو کرنا ہے، اس کا مادہ حسن (خوب صورت، اچھا، پیارا) آتا ہے جس کے مد مقابل قبح (بد صورت، برا، خراب) آتا ہے۔ اسی طرح لفظ استحسان کے مد مقابل لفظ استقباح آتا ہے جس کے معنیٰ و مفہوم کسی چیز کو ناپسند کرنا اور برا سمجھنا کے آتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابو زید عبید اللہ بن عمر دبوسیؒ (م۔430ھ/1038ء) اسی لغوی مفہوم کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"اما الاستحسان لغة فوجود الشيء حسنا؛ يقال استحسنت كذا اى اعتقدته واستقبحته على ضده."[1]

"لغوی اعتبار سے لفظ استحسان کا معنیٰ جو چیز باعتبار وجود اچھی ہو یا کسی بھی چیز کو خوب صورت و اچھا سمجھنا جیسے "استحسنت كذا" کا معنیٰ ہے کہ میں نے اس چیز کے بارے میں اچھا اعتقاد رکھا اور اس کے مد مقابل لفظ "استقبحته" کا معنیٰ ہے کہ میں نے اس چیز کو بد صورت و خراب سمجھا۔"

اسی طرح استحسان کے لغوی مفہوم کا ایک پہلو یہ ہے کہ باب استفعال کی خاصیات میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کسی چیز کی طلب کا معنیٰ پایا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ ابو موسیٰ ایوب بن موسیٰ کفویؒ (م۔1094ھ/1682ء) نے بیان کیا ہے:

"معناه طلب الاحسن للاتباع الذى هو مامور به."[2]

"اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اتباع و پیروی کے لئے مامور بہ میں سب سے بہتر کی تلاش و جستجو کرنے کا نام استحسان ہے۔"

استحسان کا اصطلاحی مفہوم:

فقہائے کرامؒ نے اپنے اپنے مزاج و ذوق کے پیشِ نظر استحسان کی معمولی الفاظ کے فرق کے ساتھ متعدد تعریفیں کی ہیں؛ جن کے درمیان لفظی اعتبار سے تو فرق پایا جاتا ہے، لیکن عملاً استحسان کو بطور دلیل سب تسلیم کرتے ہیں اور اس پر کسی نہ کسی اعتبار سے عمل بھی کرتے ہیں۔ چناں چہ حنفیہؒ کے نامور اور عظیم فقیہ امام ابو الحسن عبید اللہ بن حسین کرخیؒ (م۔340ھ/951ء) نے حنفیہؒ کی نمائندگی کرتے ہوئے استحسان کی بڑی جامع تعریف کی ہے:

"الاستحسان هو أن يعدل الإنسان عن أن يحكم في المسألة بمثل ما حكم به في نظائرها إلى خلافه؛
لوجه أقوى من الأول يقتضي العدول من الأول."[3]

"استحسان سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی مسئلے میں اس فیصلے سے ہٹ کر فیصلہ دے جو اس کے مشابہ مسائل میں پہلے دیا گیا ہو، اس کا یہ فیصلہ کسی ایسے سبب کی بناء پر ہو جو سابقہ فیصلے سے قوی تر بھی ہو، اور اس سے انحراف کا متقاضی بھی ہو۔"

[1] دبوسی، عبید اللہ بن عمر، تقویم الادلۃ فی اصول الفقہ، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 2001ء، ص404۔
[2] کفوی، ایوب بن موسیٰ، الکلیات معجم فی المصطلحات والفروق اللغویۃ، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، 1/107۔
[3] ابو الحسین بصری، محمد بن علی، المعتمد فی اصول الفقہ، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 1403ھ، 2/296۔

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

علامہ کرخیؒ کی مذکورہ تعریف چند الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ مختلف کتب میں نقل کی گئی ہے۔[1] اور یہ تعریف حنفیہؒ کے استحسان کی حقیقت وماہیت کو سب سے زیادہ واضح کرنے والی ہے، جو بعد کی تمام تعریفات میں اساس وبنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

مالکیہؒ میں سے علامہ قاضی ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابن العربیؒ (543ھ / 1240ء) سے استحسان کی درج ذیل تعریف منقول ہے:

"ترك مَا يَقْتَضِيهِ الدَّلِيل على طَرِيق الِاسْتِثْنَاء والترخص، بمعارضته مَا يُعَارضهُ فِي بعض مقتضياته."[2]

دلیل کے مقتضیٰ کو استثنا اور ترخص کے طریقے پر ترک کرنا کسی ایسے عارض کی وجہ سے جو اس کے بعض مقتضیٰ میں پیش آتا ہو۔

حنابلہؒ میں سے علامہ ابو محمد عبد اللہ بن احمد ابن قدامہ مقدسیؒ (م۔620ھ / 1223ء) سے استحسان کی درج ذیل بڑی جامع تعریف منقول ہے، جو کہ اکثر کتبِ حنابلہؒ میں بھی موجود ہے:

"هُوَ الْعُدُول بِحكم الْمَسْأَلَة عَن نظائرها لدَلِيل شَرْعِي خَاص من كتاب أو سنة."[3]

"قرآن وسنت کیکسی خاص دلیلِ شرعی کی وجہ سے درپیش مسئلے کے حکم کو اس کے نظائر سے ہٹادینا۔"

یعنی زیر بحث مسئلے کی نوعیت اگرچہ اس کے نظائر سے ملتی جلتی ہے لیکن قرآن وسنت کی کسی خاص دلیل کی وجہ سے اس کا حکم اس کے نظائر سے مختلف ہو جاتا ہے تو اسی کا نام استحسان ہے۔

مذکورہ تمام تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کی ضرورت ومصلحت کے پیشِ نظر شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے استحسان کے ذریعے اُمتِ مسلمہ سے مشقت وتکلیف، حرج وتنگی اور ضرر کو بالکل ختم کیا جاتا ہے۔

اُصولِ استحسان کی شرائط:

فقہائے کرامؒ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ استحسان تین چیزوں سے مرکب ہے؛ جنہیں ہم استحسان کے ارکان یا شرائط کہہ سکتے ہیں:

1۔ معدول عنہ 2۔ معدول الیہ 3۔ وجہِ عدول

---

[1] ابن برہان، احمد بن علی، الوصول الی الاصول، بیروت، دار الفکر المعاصر، 2009ء، 2/ 321؛ ابن سبکی، عبد الوہاب بن علی، الابہاج فی شرح المنہاج، بیروت، دار الکتب العلمیہ، س۔ن، 3/ 189؛ ابن عقیل، علی بن عقیل، الواضح فی اصول الفقہ، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ، 2008ء، 2/ 102؛ آمدی، علی بن ابی علی، الِاحکام فی اصول الأحکام ، بیروت، المکتب الِاسلامی، س۔ن، 4/ 158؛ بصری، محمد بن علی، شرح العمد، قاہرہ، دار المطبعۃ السلفیہ، 1410ھ، 2/ 90؛ امام الحرمین جوینی، عبد الملک بن عبد اللہ، التلخیص فی اصول الفقہ، بیروت، دار البشار الاسلامیہ، س۔ن، 3/ 311؛ تفتازانی، سعد الدین مسعود بن عمر، شرح التلویح علی التوضیح، مصر، مکتبہ صبیح، س۔ن، 2/ 183؛ شیرازی، ابراہیم بن علی، التبصرۃ فی اصول الفقہ، دمشق، دار الفکر، 1403ھ، ص 493؛ شرح اللمع، ترکی، دار الغرب الاسلامی، 1988ء، 2/ 969؛ غزالی، محمد بن محمد، المستصفٰی، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 2013ء، 2/ 184؛ غزالی، المنخول من تعلیقات الاصول، بیروت، دار الفکر المعاصر، 2011ء، ص 477؛ فخر الدین رازی، محمد بن عمر، المحصول، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، 1997ء، 6/ 125؛ شاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، الاعتصام، دار ابن عفان، سعودیہ، طبع اول، 1412ھ، 2/ 193؛ قواطع الادلۃ فی الاصول، 2/ 270۔

[2] ابن العربی، محمد بن عبد اللہ، المحصول فی اصول الفقہ، دار البیارق، 1999ء، ص 133۔

[3] ابن قدامہ، عبد اللہ بن احمد، روضۃ الناظر وجنۃ المناظر فی اُصول الفقہ، مؤسسۃ الریان للطباعۃ والنشر والتوزیع، 2002ء، 1/ 473؛ المسودۃ فی اصول الفقہ، ص 451؛ ابن اللحام، علی بن محمد، المختصر فی اُصول الفقہ علی مذہب الامام احمد بن حنبل، مکہ مکرمہ، جامعۃ الملک عبد العزیز، ص 162؛ ابن نجار، محمد بن احمد، مختصر التحریر شرح الکوکب المنیر، مکتبۃ العبیکان، 1997ء، 4/ 431؛ ابن بدران، عبد القادر بن احمد، المدخل اِلی مذہب الِامام احمد بن حنبل، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ، 1401ھ، ص 291۔

1۔ استحسان کی مثالوں میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معدول عنہ (قیاسِ جلی) سے تین چیزیں مراد ہوتی ہیں: نصِ عام یا قاعدہ منصوصہ، حکمِ قیاسی اور وہ قاعدہ کلیہ جو مختلف نصوص اور دلائل سے مستنبط ہو۔[1]

2۔ معدول الیہ میں دو چیزیں شامل ہو سکتی ہیں: پہلی مسئلہ استحسانیہ، یعنی خاص جزئیہ جس میں نصِ خاص، قیاسِ خفی وغیرہ کو ترجیح دے کر قیاسِ ظاہر کے خلاف دوسرا حکم لگایا گیا ہو۔ جیسے بیع سلم، قہقہہ وغیرہ۔ دوسری مسئلہ استحسانیہ میں جواز یا عدمِ جواز کا جو حکم جاری کیا گیا اس کی شرعاً معتبر دلیل یعنی نص، اجماع، قیاسِ خفی وغیرہ۔

3۔ استحسان کی مختلف اقسام کے اعتبار سے وجہ عُدول یا علتِ استحسانیہ مختلف ہو سکتی ہے۔ مثلاً استحسان بالنص والے اجماع میں نص اور اجماع کی قوت، علتِ عدول یا وجہ ترجیح ہے۔ اسی طرح استحسان بالقیاس الخفی میں قیاس خفی کی قوت اثر اور مناسبت وجہ عدل ہے۔[2]

فقہائے اربعہ اور استحسان کی اُصولی تکییف:

فقہائے اربعہؒ میں سے امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ (م۔150ھ/767ء)، امام ابو عبد اللہ مالک بن انسؒ (م۔179ھ/795ء) اور امام ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبلؒ (م۔241ھ/855ء) استحسان کے قائل ہیں اور اثباتِ حکم کے لئے اسے حجتِ شرعیہ سمجھتے ہیں، جب کہ امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعیؒ (م۔204ھ/820ء) اس کی حجیت کے قائل نہیں ہیں۔

فقہائے حنفیہ کا نقطۂ نظر:

فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک استحسان کی مختلف اقسام میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استحسان وہی معتبر ہوتا ہے جو کسی دلیل شرعی سے مستنبط ہو، جس طرح قیاس وہی معتبر ہوتا ہے جو دلیل شرعی سے مستنبط ہو۔[3] **مزید یہ کہ حنفیہؒ نے قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کی طرح مصلحت یا استحسان کو مستقل ماخذ تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان کے ہاں استحسان یا مصلحت ایک استثنائی طریقہ ہے جو قیاس ہی کے تابع ہے۔ ان کے نزدیک اصل ماخذ قیاس ہے، لیکن بسا اوقات قیاس پر عمل کرنے کی وجہ سے ایک ناقابل برداشت تکلیف لاحق ہو سکتی ہے، جسے ختم کرنے کے لئے استحسان کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔**[4]

فقہائے مالکیہ کا نقطۂ نظر:

فقہائے مالکیہؒ نے مصلحت مرسلہ کو باقاعدہ ماٴخذ بنا کر اس پر بحث کی ہے، اور انہوں نے استحسان کو مصلحت مرسلہ کی ایک ضمنی قسم کے طور پر ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ یا حادثہ میں نصوص اور دیگر دلائل کی عدم موجودگی میں ان کے ہاں مصالح باقاعدہ مستقل اُصول و ماٴخذ ہے۔[5]

حنفیہؒ اور مالکیہؒ دونوں نے استحسان کے ضمن میں مصلحت کا اعتبار کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ حنفیہؒ نے مصلحت کو استحسان کا تابع بنا کر اس کے ضمن میں مصلحت کا ذکر کیا ہے، جب کہ مالکیہؒ نے مصلحت کو اصل ماٴخذ قرار دے کر استحسان کو اس کے ضمن میں تبعاً ذکر کیا ہے۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ حنفیہؒ اس موضوع میں استحسان کے دروازے سے داخل ہوئے اور استصلاح یا مصلحت کے دروازے سے نکلے، جب کہ مالکیہؒ نے اس کے برعکس کیا ہے، یعنی وہ اس موضوع میں استصلاح و مصلحت کے دروازے سے داخل ہو کر استحسان کے دروازے سے باہر نکل گئے۔

---

[1] کولہاپوری، زبیر بن قاسم، مفتی، استحسان حقیقت، ارکان، اقسام، انڈیا، جامعہ علوم القرآن جمبوسر، 2020ء، ص75، بحوالہ، میزان الاصول، ص575۔

[2] ایضاً، ص81۔

[3] سرخسی، محمد بن احمد، اصول السرخسی، بیروت، دار المعرفۃ، س۔ن، 2/201۔

[4] مصطفٰی زرقا، ڈاکٹر، الاستصلاح والمصالح المرسلۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ واصول فقہھا، دمشق، دار القلم، 1988ء، ص61۔

[5] شاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، الاعتصام، مکہ مکرمہ، دار ابن الجوزی للنشر والتوزیع، 2008ء، 3/41-35۔

فقہائے شافعیہؒ کا نقطۂ نظر:

حنفیہؒ و مالکیہؒ جس قدر استحسان کی حجیت کے قائل ہیں، شافعیہؒ کا رویہ اسی قدر اُصولِ استحسان کے بارے میں سخت ہے۔ امام شافعیؒ نے اصول فقہ پر اپنی مختصر کتاب "الرسالہ" میں بڑی شد و مد کے ساتھ استحسان پر نقد کیا ہے:

"وإنما الاستحسان تلذُّذ."[1]

"استحسان صرف لذت پرستی کا نام ہے۔"

اس کے ساتھ ساتھ آپؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب "الامّ" میں بھی ایک مستقل فصل "کتاب ابطال الاستحسان" کے عنوان سے قائم کی ہے، جس میں اس موضوع پر رد موجود ہے، آپؒ کی رائے کے مطابق ایسا ممکن نہیں کہ انسان کو کسی حکم کی ضرورت ہو اور شریعت نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی ہو، بلکہ انسان کی تمام ضروریات و اعمال کا مکمل حل پیش کیا گیا ہے، خواہ قرآن و سنت کی واضح نصوص کے ذریعے ہو یا قیاس و اجتہاد کے ذریعے، اب انہی مآخذ پر ہی انحصار لازم ہے۔[2] اس لئے ان کے نزدیک قرآن و سنت اور قیاس کے علاوہ کسی اور ذریعے کو ماخذ نہیں قرار دیا جا سکتا، جیسا کہ آپؒ کا مشہور و معروف قول ہے:

"من استحسن فقد شرع."[3]

"جس نے استحسان پر عمل کیا، اس نے نئی شریعت ایجاد کی۔"

فقہائے حنابلہؒ کا نقطۂ نظر:

حنابلہؒ بھی مالکیہؒ کی طرح احکام کے استنباط میں مصلحت کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن اس کو مالکیہ کی طرح ایک الگ اور مستقل اُصول نہیں مانتے، بلکہ حنفیہؒ کی طرح مصالح کو قیاس کا تابع قرار دے کر اس کی ایک قسم تسلیم کرتے ہیں۔[4]

اُصولِ استحسان کی جدید مسائل پر تطبیقات:

اس عنوان کے تحت دو جدید مسائل ذکر کئے گئے ہیں جنہیں اُصولِ استحسان کی مدد سے حل کیا گیا ہے۔ جن میں سے پہلا مسئلہ استبدالِ وقف کی شرعی حیثیت اور دوسرا مسئلہ زوجین میں تنسیخِ نکاح کی شرعی حیثیت، اب ان دونوں کی وضاحت ذیل میں پیش ہے۔

استبدالِ وقف:

شریعتِ اسلامیہ میں "وقف" کا ایک مضبوط اور مستقل نظام موجود ہے؛ جو عہدِ نبوی ﷺ سے غیر معمولی تسلسل سے اب تک قائم و دائم ہے۔ اسی کے پیشِ نظر مسلمانوں نے نیکی و بھلائی اور خیراتی مقاصد کے لئے اپنی قیمتی جائیدادیں، خواہ مساجد و مدارس کی شکل میں ہوں یا ان پر وقف شدہ جائیدادیں اور عمارتیں ہوں، وقف کی ہیں جو آج بھی جاری و ساری اور باقی ہیں۔ استبدالِ وقف کے مسئلے کی فقہی حیثیت بیان کرنے سے پہلے وقف سے متعلق بنیادی باتیں جاننا بے حد ضروری ہیں، جو کہ ذیل میں پیش ہیں:

وقف کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم:

---

[1] شافعی، محمد بن ادریس، الرسالہ، مصر، مکتبہ حلبی، 1940ء، ص 507۔

[2] شافعی، محمد بن ادریس، الام، بیروت، دار المعرفہ، 1990ء، 7/309۔

[3] المستصفیٰ، 1/171؛ المنخول، 1/476؛ روضۃ الناظر و جنۃ المناظر، 1/475؛ الإحکام فی اصول الأحکام، 4/157؛ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، 4/29؛ الابہاج فی شرح المنہاج، 3/188؛ الاعتصام، 3/47؛ البحر المحیط فی اصول الفقہ، 8/95؛ المختصر فی اصول الفقہ علی مذہب الامام احمد بن حنبل، ص 45؛ التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال بن الہمام، 3/222۔

[4] الإحکام فی اصول الأحکام، 4/156۔

لغوی اعتبار سے وقف متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے؛ جن میں سے ایک معنیٰ ٹھرنا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ."[1]

"اور ذرا انہیں ٹھراؤ، ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔"

اسی طرح موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں بھی وقف متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے:

"مِنْ مَعَانِي الْوَقْفِ فِي اللُّغَةِ: الْحَبْسُ، يُقَال: وَقَفْتُ الدَّارَ وَقْفًا: حَبَسْتُهَا فِي سَبِيل اللَّهِ، وَمِنْهَا الْمَنْعُ، يُقَال: وَقَفْتُ الرَّجُل عَنِ الشَّيْءِ وَقْفًا: مَنَعْتُهُ عَنْهُ."[2]

"لغت میں وقف کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے: (پہلا معنیٰ) حبس و روکنا جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے گھر وقف کر دیا؛ یعنی اسے اللہ کی راہ میں دے دیا۔ (دوسرا معنیٰ) منع کرنا جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے کسی آدمی کو کسی چیز سے وقف کر دیا؛ یعنی اس سے منع کر دیا۔"

فقہائے کرامؒ نے وقف کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں؛ جن میں سے ایک مشہور و معروف تعریف جو امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ (م۔150ھ/767ء) سے منقول ہے، جسے علامہ برہان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانیؒ (م۔593ھ/1197ء) نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حبس العين على ملك الواقف؛ والتصدق بالمنفعة بمنزلة العارية."[3]

"کسی چیز کو وقف کرنے والے کی ملک میں روک دینا اور اس کی منفعت کو عاریت کی طرح صدقہ و خیرات کر دینا۔"

حضراتِ صاحبین یعنی قاضی القضاۃ امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیمؒ (م۔182ھ/798ء) اور فقیہ عراق امام محمد بن حسن شیبانیؒ (189ھ/805ء) سے درج ذیل تعریف منقول ہے:

"حبس العين على حكم ملك الله تعالى فيزول ملك الواقف عنه إلى الله تعالى على وجه تعود منفعته إلى العباد."[4]

"کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملک کے حکم پر روک دینا پھر وہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں اس طرح پہنچ جائے گی کہ اس کی منفعت بندوں کی طرف لوٹ جائے گی۔"

مذکورہ تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی رائے کے مطابق وقف شدہ چیز واقف کی ملکیت میں رہتی ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں نہیں جاتی، جب کہ صاحبینؒ کی رائے کے مطابق وہ واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔

پنجاب وقف پراپرٹیز آرڈیننس 1979ء میں وقف کی درج ذیل تعریف کی گئی ہے:

" Waqf property memns property of any kind permanently dedicated by a Person professing Islam for any purpose recognized by Islam as religious, Pious or charitable."[5]

"وقف جائیداد سے مراد کسی بھی قسم کی وہ جائیداد ہے جو مستقل طور پر اسلام کے ماننے والے شخص کے ذریعے کسی ایسے مقصد کے لئے مختص کی گئی ہو جسے اسلام نے ایک مذہبی، پرہیزگاری یا خیراتی حیثیت میں تسلیم کیا ہو۔"

---

[1] الصافات:24۔

[2] الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، کویت، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ، 1404ھ۔1427ھ، 44/108۔

[3] مرغینانی، علی بن ابی بکر، الہدایہ فی شرح بدایۃ المبتدی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س۔ن، 3/15۔

[4] ایضاً۔

[5] Vidya Varruti V. Blusami, AIR, 1992, PC 123.3.

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مذکورہ تعریفات اور فقہ اسلامی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی قیمتی چیز کی ذات کو اللہ تعالیٰ کی ملک میں مقید کر دینا اور اس کے منافع کو دوسروں پر مذہبی و خیراتی مقاصد کے تحت نیک نیتی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صدقہ کر دینے کا واضح اظہار وقف کہلاتا ہے۔ وقف کرنے والے کو واقف؛ جسے نفع و فائدہ پہنچانے کی غرض سے وقف ہوا اُسے "موقوف علیہ" یا "موقوف علیہم" اور تحریر کے ذریعے وقف کا اظہار ہوا اسے "وقف نامہ" کہتے ہیں۔

استبدالِ وقف اور اُصولِ استحسان:

استبدالِ وقف سے مراد یہ ہے کہ وقف شدہ چیز کو فروخت کر کے اس کی جگہ کوئی دوسری چیز خریدنا؛ یا وقف شدہ چیز کا کسی دوسری چیز سے تبادلہ کرنا استبدالِ وقف کہلاتا ہے۔ استبدالِ وقف میں واقف کی شرائط (اگر اُس نے وقف نامے میں کسی قسم کی شرائط تحریر کی تھیں) اور وقف کی ضرورت و مصلحت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

چناں چہ استبدالِ وقف کی مشہور دو صورتیں ہیں: جن میں سے پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے وقف کرتے وقف نامے میں یہ صراحت کی تھی کہ اگر وقف کی آمدنی میں کمی کی وجہ سے مصارف پورے نہ ہوں یا مصارف پورے ہونے میں دشواری ہو؛ اور اس کی تبدیلی سے آمدنی زیادہ ہو جائے جس کی وجہ سے مصارف آسانی کے ساتھ پورے ہوں تو ایسی صورت میں متولی کو استبدالِ وقف کی اجازت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وقف شدہ وہ جائیداد جہاں آبادی کم ہو گئی یا لوگوں کا رجحان اُس طرف کم ہو گیا جس کی وجہ سے یہ جائیداد زیادہ فائدہ مند نہیں رہی؛ یا وہ مکانات اور دکّانیں جن کی آمدنی مساجد و مدارس یا کسی ادارے کے لئے وقف تھی، وہ لوگوں کے کار آمد نہ ہونے کی وجہ سے بالکلیہ غیر نفع بخش ہو گئیں، تو ایسی صورتِ حال میں فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے غیر نفع بخش وقف کو کسی دوسرے زیادہ نفع بخش سے تبدیل کرنا مصلحت کے پیشِ نظر جائز ہے۔ چناں چہ علامہ محمد امین بن عمر ابن عابدین شامیؒ (م۔1252ھ/1836ء) استبدالِ وقف کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَالثَّانِي: أَنْ لَا يَشْرُطَهُ سَوَاءٌ شَرَطَ عَدَمَهُ أَوْ سَكَتَ لَكِنْ صَارَ بِحَيْثُ لَا يُنْتَفَعُ بِهِ بِالْكُلِّيَّةِ بِأَنْ لَا يَحْصُلَ مِنْهُ شَيْءٌ أَصْلًا، أَوْ لَا يَفِي بِمُؤْنَتِهِ فَهُوَ أَيْضًا جَائِزٌ عَلَى الْأَصَحِّ إذَا كَانَ بِإِذْنِ الْقَاضِي وَرَأْيِهِ الْمَصْلَحَةَ فِيهِ."[1]

"دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی کوئی شرط نہیں لگائی خواہ عدم شرط ہو یا سکوت ہو، لیکن وقف کی جائیداد کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ اس سے کلی طور پر انتفاع حاصل نہ ہو یا اصلاً اس سے کچھ حاصل نہ ہو یا اتنی مقدار ہو جس سے مصارف و اخراجات پورے نہ ہوں تو ایسی صورت میں قاضی کی اجازت سے استبدال جائز ہے، اور قاضی کی رائے میں وقف کی مصلحت بھی ہو۔"

علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد ابن الہمامؒ (م۔861ھ/1457ء) نے اسی مسئلے میں بڑی تفصیلی گفت گو کی ہے اور استبدال کی شرائط، اس کے جواز اور عدم جواز کے پہلوؤں کا جائزہ لیا، اور فقہائے کرامؒ کی آرا کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نقطۂ نظر بھی بیان کیا ہے کہ استبدال کی شرطوں کی رعایت اور واقف کے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنانے کی غرض سے متبادل اوقاف قائم کرنے سے وقف باطل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ بہتر صورت اختیار کرنا ہوتا ہے:

"وَلَوْ شَرَطَ أَنْ يَسْتَبْدِلَ بِهَا أَرْضًا أُخْرَى تَكُونُ وَقْفًا مَكَانَهُ فَهُوَ جَائِزٌ عِنْدَ أَبِي يُوسُفَ وَهِلَالٍ وَالْخَصَّافِ، وَهُوَ اسْتِحْسَانٌ."[2]

"ایک زمین کا دوسری زمین کے ساتھ استبدالِ وقف امام ابو یوسف، امام ہلال اور امام خصاف کے نزدیک استحساناً جائز ہے۔"

مذکورہ فقہی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل و تنگ دستی کے حالات میں یا بوقتِ ضرورتِ شدیدہ متولی کو وقف شدہ جائیداد کے استبدال اور منتقلی کی استحسان کے اُصول کے پیشِ نظر (مسجد کے علاوہ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) اجازت ہے۔

---

[1] ابن عابدین، محمد بن عمر، رد المحتار علی الدر المختار، بیروت، دار الفکر، 1992ء، 4/384۔

[2] ابن الہمام، کمال الدین، محمد بن عبد الواحد، فتح القدیر، بیروت، دار الفکر، س۔ن، 6/227۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مساجد کے استبدال کی شرعی حیثیت:

مساجد کے استبدال کا معاملہ دیگر اوقاف کے مقابلے میں منفرد و الگ ہے، اس لئے کہ جمہور کے نزدیک مساجد کے استبدال کی بالکل اجازت نہیں؛ خواہ وہاں سے آبادی منتقل ہوگئی ہو یا بالکل ختم ہوگئی ہو، کسی صورت میں بھی مساجد کا استبدال اور منتقلی جائز نہیں ہے:

"وَكَذَا لَوْ خَرِبَ وَلَيْسَ لَهُ مَا يُعْمَرُ بِهِ وَقَدْ اسْتَغْنَى النَّاسُ عَنْهُ لِبِنَاءِ مَسْجِدٍ آخَرَ قَوْلُهُ: عِنْدَ الْإِمَامِ وَالثَّانِي فَلَا يَعُودُ مِيرَاثًا وَلَا يَجُوزُ نَقْلُهُ وَنَقْلُ مَالِهِ إلَى مَسْجِدٍ آخَرَ، سَوَاءٌ كَانُوا يُصَلُّونَ فِيهِ أَوْ لَا وَهُوَ الْفَتْوَى حَاوِي الْقُدْسِيِّ، وَأَكْثَرُ الْمَشَايِخِ عَلَيْهِ مُجْتَبَى وَهُوَ الْأَوْجَهُ فَتْحٌ. قَالَ فِي الْإِسْعَافِ وَذَكَرَ بَعْضُهُمْ أَنَّ قَوْلَ أَبِي حَنِيفَةَ كَقَوْلِ أَبِي يُوسُفَ."[1]

"اگر مسجد کے ارد گرد کی آبادی ویران ہو جائے اور اسے آباد کرنے کی کوئی صورت بھی نہ ہو، اور لوگ کسی دوسری مسجد کی تعمیر کی وجہ سے اس سے مستغنی ہوگئے ہوں تو اس صورت میں امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، نہ میراث میں لوٹے گی؛ نہ ہی اسے منتقل کرنا جائز ہو گا اور نہ ہی اس کا مال و میٹریل دوسری مسجد میں منتقل کرنا جائز ہو گا، خواہ لوگ اس میں نماز ادا کرتے ہوں یا نہیں، اکثر مشائخ و فقہا کی یہی قابلِ ترجیح رائے ہے اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔"

امام ابو یوسفؒ سے استبدالِ مسجد کے حوالے سے دو قول منقول ہیں: ایک جوازِ استبدال کا جو کہ مرجوح ہے، اور دوسرا قول عدمِ استبدال کا ہے جو ماقبل کی عبارت میں امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور یہی دوسرا قول راجح ہے۔ جسے علامہ زین الدین بن ابراہیم ابن نجیم مصریؒ (م۔970ھ/1562ء) نے نقل کیا ہے:

"وَقَالَ أَبُو يُوسُفَ: هُوَ مَسْجِدٌ أَبَدًا إلَى قِيَامِ السَّاعَةِ لَا يَعُودُ مِيرَاثًا وَلَا يَجُوزُ نَقْلُهُ، وَنَقْلُ مَالِهِ إلَى مَسْجِدٍ آخَرَ سَوَاءٌ كَانُوا يُصَلُّونَ فِيهِ أَوْ لَا وَهُوَ الْفَتْوَى."[2]

"امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ وہ جگہ ہمیشہ کے لئے تاقیامت مسجد ہی رہے گی، نہ وہ میراث میں لوٹے گی اور نہ اس کی اور اس کے سامان کی منتقلی دوسری مسجد کی طرف ہو گی، خواہ لوگ اس میں نماز پڑھتے ہوں یا نہیں؛ یہی راجح اور مفتیٰ بہ قول ہے۔"

مذکورہ فقہی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل و تنگ دستی کے حالات میں یا بوقتِ ضرورتِ شدیدہ بھی متولی کو مسجد کا استبدل اور اس کی منتقلی بالکل جائز نہیں ہے۔

مساجد پر وقف شدہ زمین یا مکان کے استبدال کی شرعی حیثیت:

مساجد پر وقف شدہ زمین یا مکان و دکان جو مساجد کی آمدنی کے لئے ہیں، ان کا حکم بیع کی حرمت اور استبدال میں مساجد کی طرح نہیں ہے، جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (م۔1394ھ/1974ء) نے ظہیریہ کے حوالے سے ایک فتویٰ نقل کیا ہے:

"سئل عن الحلوانی عن أوقاف المساجد إذا تعطلت و تعذر استغلالها هل للمتولی أن يبيعها و يشتری بثمنها أخریٰ قال: نعم!."[3]

"امام حلوانیؒ سے مساجد کے ان اوقاف کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ناکارہ ہوگئے ہوں اور ان سے آمدنی حاصل کرنا دشوار ہو گیا ہو تو کیا متولی کے لئے یہ جائز ہے کہ ان کو فروخت کر دے، اور ان کی قیمت سے دوسری جائیداد خرید لے۔ آپ نے جواب میں کہا کہ ہاں ایسا کر سکتا ہے۔"

لہٰذا مسجد پر وقف شدہ زمین یا مکان و دکان کا استبدال مسجد کی ضرورت کے پیشِ نظر جائز ہے۔

---

[1] رد المحتار علی الدر المختار، 4/358۔

[2] ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم، البحر الرائق شرح کنز الدقائق، دار الکتاب الاسلامی، س۔ن، 5/272۔

[3] عثمانی، ظفر احمد، مولانا، اعلاء السنن، کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، س۔ن، 13/196۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اسی طرح اگر کوئی کم نفع بخش مکان یا دکان ہو تو اسے فروخت کر کے زیادہ نفع بخش مکان یا دکان خریدنا بھی مصلحت وضرورت کی وجہ سے جائز ہے کیوں کہ یہ انفع للوقف ہے۔ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے:

"امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ وقف کے استبدال میں کوئی حرج نہیں؛ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر مکان وقف کیا، جب آپؓ صفین چلے گئے تو فرمایا کہ اگر مکان دور معلوم ہو رہا ہو تو اسے فروخت کر دو اور اس کی قیمت آپس میں تقسیم کر لو حالاں کہ اصل وقف میں بیع کی شرط نہیں لگائی تھی۔"[1]

مذکورہ تمام عبارات کا حاصل یہ ہے کہ وقف شدہ کم نفع بخش مکان ودکان کو فروخت کر کے زیادہ نفع بخش مکان یا دکان خریدنا ضرورت و مصلحت کی وجہ سے جائز ہے اور وقف کے مصالح ومفاد کے عین موافق ہے، لیکن اس میں دیانت دار اور شریعت کے احکام ومسائل سے واقف متولیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

آخر میں اس موضوع پر فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیرِ اہتمام بمبئ اکتوبر 1997ء میں ایک سیمینار ہوا تھا، جس میں وقف سے متعلق کئی تجاویز منظور ہوئیں جن میں سے ایک تجویز یہ تھی:

"مساجد کے علاوہ دوسرے وہ اوقاف جو ان مقامات میں واقع ہیں جہاں پر دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انہیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے، اور ان اوقاف پر قبضہ غاصبانہ کا پورا خطرہ ہے ایسے اوقاف کو فروخت کر کے دوسرے مقامات پر اسی نوع کے اوقاف قائم کرنا درج ذیل چند شرائط کے ساتھ درست ہے۔

1۔ وقف جائیداد کی فروختگی مناسب قیمت پر مارکیٹ ویلیو کا لحاظ کرتے ہوئے کی جائے، اتنی کم قیمت پر اسے فروخت نہ کی جائے جتنی کم قیمت قیمتوں کے ماہرین نہیں لگا سکتے۔

2۔ وقف کو فروخت کرنے والے متولی یا وقف افسر اس کی فروختگی اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا کسی ایسے شخص کے ہاتھ نہ کرے جس سے اس کا مفاد وابستہ ہو، اسی طرح کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروختگی نہ کرے جس کا قرض یا مالی دَین (قرض) کرنے والے کے ذمہ لازم ہے (یہ بنیادی شرائط ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور شرائط ہیں)۔"[2]

زوجین میں تنسیخِ نکاح کی شرعی حیثیت:

اگر خاوند اپنی بیوی پر ظلم وزیادتی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حقوقِ زوجیت بھی ادا نہیں کرتا اور بیوی کے طلاق مانگنے پر اُسے طلاق بھی نہیں دیتا، اور نہ ہی ضرورت کے مطابق اُسے خرچہ دیتا ہے۔ تو ایسی صورتِ حال میں بیوی عدالت میں اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ پیش کرتی ہے، اور اپنے دعوے کو دو گواہوں سے ثابت کر دے، پھر اگر قاضی کے طلب کرنے پر اس کا خاوند عدالت میں حاضر ہو جائے تو اس سے اس کی بیوی کے الزام کے بارے میں جواب طلب کرے، اگر وہ اپنی غلطیاں تسلیم کر لے تو قاضی خاوند کو حکم دے کہ بیوی کے حقوق ادا کرو یا طلاق دے دو، ورنہ تفریق کر دوں گا۔ اب بھی اگر شوہر کوئی صورت قبول نہ کرے تو قاضی کو شرعاً اختیار ہو گا کہ وہ دونوں کا نکاح فسخ کر دے۔ دوسری صورت یہ کہ عدالتی نوٹس کے باوجود خاوند عدالت میں پیش ہی نہیں ہوتا تو پھر کیا گواہوں کی بنیاد پر ہی عورت کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے ان دونوں کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا یا نہیں؟

زوجین میں تنسیخِ نکاح کا ثبوت قرآن سے:

زوجین میں تفریق کے حوالے سے درج ذیل آیت سے استدلال کیا جاتا ہے:

---

[1] ابو زہرہ، محمد، محاضرات فی الوقف، بیروت، دار الفکر العربی، ص165۔

[2] منقول از تجاویز بابت اوقاف بمقام بمبئ 1997ء؛ https://share.google/9GGFi8mp3gkm3dwXm

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ."[1]

"پس یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ (اپنی زوجیت میں) روک رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو۔ اور انہیں ستانے کی خاطر اس لئے روک کر نہ رکھو کہ ان پر ظلم کر سکو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا۔"

علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبیؒ (م۔671ھ/1273ء) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا فرمان: "فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ" معروف طریقے سے روکنے سے مراد خاوند کا اپنی بیوی کے حقوق کو ادا کرنا ہے اور اسی وجہ سے علما کی ایک کثیر تعداد نے یہ کہا ہے کہ خاوند کے پاس جب بیوی کو نفقہ دینے کی طاقت نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ بیوی کو معروف طریقے سے الگ کرنے کی حد سے نکل گیا، پھر حاکم کہ وہ اس کی بیوی پر طلاق واقع کر دے، کیوں کہ جو شخص اسے خرچ دینے پر قادر نہیں ہے اس کے نکاح میں رہنے سے اس عورت کو ضرر لاحق ہو گا اور بھوک پر صبر نہیں ہو سکتا۔ اسی نقطۂ نظر کے قائلین میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق، امام ابو ثور، امام ابو عبید، امام یحیٰ قطان، امام عبد الرحمان بن مہدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم، تابعین میں سے سعید بن مسیب اور صحابہ کرام میں حضرت عمر فاروق، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم شامل ہیں۔"[2]

زوجین میں تفریق کا ثبوت حدیث سے:

مذکورہ مسئلے کی تائید درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں خاوند کو صرف دو آپشن دیئے گئے ہیں: یا تو خوشی خوشی بیوی کو رکھو یا تو اسے طلاق دے کر آزاد کر دو۔

"قَالَ: وَمَنْ أَعُولُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: "امْرَأَتُكَ تَقُولُ: أَطْعِمْنِي وَإِلَّا فَارِقْنِي."[3]

"کسی سائل نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول میر اعیال کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تمہاری بیوی! جو کہتی ہے کہ مجھے کھلاؤ یا مجھے اپنے سے الگ کر دو۔"

زوجین میں تفریق اور فقہائے کرام:

علامہ ابو الولید محمد بن احمد ابن رشدؒ (م۔595ھ/1198ء) نے زوجین میں تفریق کے حوالے سے اکثر فقہائے کرام کا مذہب نقل کیا ہے:

"وَأَمَّا الْإِعْسَارُ بِالنَّفَقَةِ: فَقَالَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ، وَأَحْمَدُ، وَأَبُو ثَوْرٍ، وَأَبُو عُبَيْدٍ وَجَمَاعَةٌ: يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا، وَهُوَ مَرْوِيٌّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، وَسَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ. وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ، وَالثَّوْرِيُّ: لَا يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا، وَبِهِ قَالَ أَهْلُ الظَّاهِرِ. وَسَبَبُ اخْتِلَافِهِمْ: تَشْبِيهُ الضَّرَرِ الْوَاقِعِ مِنْ ذَلِكَ بِالضَّرَرِ الْوَاقِعِ مِنَ الْعُنَّةِ."[4]

"بیوی کو نفقہ دینے سے عاجز شوہر کے بارے میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو ثور، امام ابو عبید اور کئی حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ زوجین میں تفریق کر دی جائے گی، حضرت ابو ہریرہ اور سعید بن مسیب بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام ثوری کے نزدیک زوجین میں تفریق نہیں کی جائے گی، اہل ظاہر کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نفقہ سے عجز کا ضرر بھی اسی طرح واقع ہوتا ہے جس طرح جماع سے عجز کا ضرر واقع ہوتا ہے۔"

مذکورہ عبارت میں اختلاف کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جمہورؒ کے نزدیک نفقہ اور جماع سے عاجز ہونا دونوں کا ایک ہی حکم ہے کیوں کہ دونوں میں ضرر ہے، جب کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ ان دونوں میں فرق کرتے ہیں یعنی آپ کے نزدیک نفقہ سے عاجز ہونے سے ضرر متحقق نہیں ہوتا اور جماع سے عاجز ہونے سے

[1] البقرۃ: 231۔

[2] قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، قاہرہ، دار الکتب المصریہ، 1964ء، 3/155۔

[3] دار قطنی، علی بن عمر، سنن الدار قطنی، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ، 2004ء، کتاب النکاح، باب المہر، 4/452، رقم الحدیث: 3780۔

[4] ابن رشد، محمد بن احمد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، قاہرہ، دار الحدیث، 2004ء، 3/75۔74

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ضرر متحقق ہو جاتا ہے اس لئے کہ نفقہ کے بغیر عورت کسی نہ کسی طرح گزارا کر سکتی ہے لیکن جماع کے بغیر عورت کا گزارا کرنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

علامہ شامیؒ کے نزدیک ضرورت و مصلحت کے پیشِ نظر ائمہ ثلاثہؒ کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے:

"فَفِي مِثْلِ هَذَا لَوْ بَرْهَنَ عَلَى الْغَائِبِ، وَغَلَبَ عَلَى ظَنِّ الْقَاضِي أَنَّهُ حَقٌّ لَا تَزْوِيرٌ، وَلَا حِيلَةَ فِيهِ فَيَنْبَغِي أَنْ يَحْكُمَ عَلَيْهِ وَلَهُ، وَكَذَا لِلْمُفْتِي أَنْ يُفْتِيَ بِجَوَازِهِ دَفْعًا لِلْحَرَجِ وَالضَّرُورَاتِ وَصِيَانَةً لِلْحُقُوقِ عَنْ الضَّيَاعِ مَعَ أَنَّهُ مُجْتَهَدٌ فِيهِ، ذَهَبَ إلَيْهِ الْأَئِمَّةُ الثَّلَاثَةُ وَفِيهِ رِوَايَتَانِ عَنْ أَصْحَابِنَا، وَيَنْبَغِي أَنْ يُنَصَّبَ عَنْ الْغَائِبِ وَكِيلٌ يَعْرِفُ أَنَّهُ يُرَاعِي جَانِبَ الْغَائِبِ وَلَا يُفَرِّطُ فِي حَقِّهِ...... قُلْت: وَظَاهِرُهُ وَلَوْ كَانَ الْقَاضِي حَنَفِيًّا وَلَوْ فِي زَمَانِنَا وَلَا يُنَافِي مَا مَرَّ؛ لِأَنَّ تَجْوِيزَ هَذَالِلْمَصْلَحَةِ وَالضَّرُورَةِ."[1]

"اسی طرح اگر غائب کے خلاف دلیل قائم کر دی گئی اور قاضی کا غالب گمان ہے کہ یہ حق ہے جھوٹ نہیں، اور نہ ہی اس میں کوئی حیلہ ہے تو غائب کے خلاف یا اُس کے حق میں فیصلہ کر دینا چاہئے۔ اسی طرح مفتی بھی دفعِ حرج، ضرورت اور لوگوں کے حقوق ضائع ہونے سے بچانے کی خاطر یہ فتویٰ دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے؛ ائمہ ثلاثہ کا یہی مذہب ہے اور ہمارے اصحاب کے بھی اس میں دو قول ہیں، اور مناسب یہ ہے کہ غائب کی طرف سے ایک وکیل کر لیا جائے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ غائب کی رعایت کرے گا اور اس کے حق میں کمی نہیں کرے گا۔۔۔ میں اس کی ظاہری حالت کے بارے میں کہتا ہوں کہ خواہ قاضی حنفی ہو اور خواہ ہمارے زمانے میں ہو اور یہ پہلے قاعدے کے خلاف نہیں ہے؛ کیوں کہ اسے ضرورت و مصلحت کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے۔"

علامہ شامیؒ کی ایک دوسری عبارت سے بھی یہی بات معلوم ہو رہی ہے کہ قاضی کو شرعاً اختیار ہے کہ وہ ان کا نکاح فسخ کر دے۔

"إذَا وَجَدَتْ الْمَرْأَةُ زَوْجَهَا مَجْبُوبًا، أَوْ مَقْطُوعَ الذَّكَرِ فَقَطْ فَرَّقَ الْحَاكِمُ بِطَلَبِهَا لَوْ حُرَّةً بَالِغَةً غَيْرَ رَتْقَاءَ وَقَرْنَاءَ وَغَيْرَ عَالِمَةٍ بِحَالِهِ قَبْلَ النِّكَاحِ وَغَيْرَ رَاضِيَةٍ بِهِ بَعْدَهُ."[2]

علامہ شامیؒ کی مذکورہ دونوں عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں فقہائے حنفیہؒ کے بھی دو قول ہونے کی وجہ سے اس کی شدت میں کمی آگئی اور دوسری بات یہ کہ ضرورت و مصلحت کی وجہ سے ائمہ ثلاثہؒ کے قول پر بھی فتویٰ دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں علامہ شامیؒ مذہبِ غیر پر فتویٰ دینے کی اجازت کے حوالے سے لکھا ہے:

"فَيَجُوزُ الْأَخْذُ بِهِ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ مَذْهَبَنَا، فَإِنَّ الْإِنْسَانَ يُعْذَرُ فِي الْعَمَلِ بِهِ عِنْدَ الضَّرُورَةِ."[3]

"اگر ہمارے مذہب میں کسی مسئلے کا حل نہ ہو تو مذہبِ غیر پر عمل کرنا جائز ہے، کیوں کہ ضرورت کے وقت اس پر عمل کرنے میں انسان معذور ہے۔"

علامہ شامیؒ کی مذکورہ دونوں عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مسئلے میں فقہائے کرام کے اجتہادات میں اختلاف ہو تو اس میں حنفی مفتی و قاضی ضرورت و مصلحت کی وجہ سے مذہبِ غیر پر فتویٰ دے سکتا ہے۔ لہٰذا مسئلۂ مذکورہ میں دفعِ حرج و ضرر اور ضرورت و مصلحت کی وجہ سے استحساناً ائمہ ثلاثہ کے مذہب پر فیصلہ کرتے ہوئے عدالت زوجین میں تنسیخِ نکاح کر سکتی ہے۔

آخر میں اس مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م۔1362ھ/1943ء) کے فتوے سے بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے:

"سوال: جو شخص باوجود قدرت کے اپنی زوجہ کے حقوق نان ونفقہ ادا نہ کرتا ہو، کیا اس کی زوجہ کو حق ہے کہ کسی طرح اپنے آپ کو اس کی زوجیت سے نکال سکے، اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار، 5/414۔

[2] ردالمحتار علی الدر المختار، 3/494۔

[3] ایضاً، 4/95۔

Vol. 2, No. 3 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

الجواب: زوجہ متعنت[1] کو اول تو لازم ہے کہ کسی طرح خاوند سے خلع وغیرہ کرلے، لیکن اگر باوجود سعی بلیغ کے کوئی صورت نہ بن سکے تو سخت مجبوری کی حالت میں مذہبِ مالکیہ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک زوجہ متعنت کو تفریق کا حق مل سکتا ہے اور سخت مجبوری کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ عورت کے خرچ کا کوئی انتظام نہ ہو سکے، یعنی نہ تو کوئی شخص عورت کے خرچ کا بندوبست کرتا ہو اور نہ خود عورت حفظ و آبرو کے ساتھ کسبِ معاش پر قدرت رکھتی ہو، اور دوسری صورت مجبوری کی یہ ہے کہ اگرچہ بسہولت یا بدقت خرچ کا انتظام ہو سکتا ہے لیکن شوہر سے علیحدہ رہنے میں ابتلاءِ معصیت کا قوی اندیشہ ہو۔ اور صورت تفریق کی یہ ہے کہ عورت اپنا مقدمہ قاضی اسلام یا مسلمان حاکم اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں جماعت المسلمین کے سامنے پیش کرے اور جس کے پاس پیشی ہو، وہ معاملہ کی شرعی شہادت وغیرہ کے ذریعے سے پوری تحقیق کرے، اور اگر عورت کا دعویٰ صحیح ثابت ہو کہ باوجود وسعت کے اس کا خاوند اس کو خرچ نہیں دیتا تو اس کے خاوند سے کہا جائے کہ اپنی عورت کے حقوق ادا کرو یا طلاق دو، ورنہ ہم تفریق کر دیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ ظالم کسی صورت پر عمل نہ کرے تو قاضی یا شرعاً جو اس کے قائم مقام ہو، طلاق واقع کر دے، اس میں کسی مدت کے انتظار و مہلت کی باتفاقِ مالکیہ ضرورت نہیں۔"[2]

خلاصہ بحث:

لفظِ استحسان باب استفعال کا مصدر ہے جس کا معنیٰ و مفہوم کسی بھی چیز کو اچھا سمجھنا اور بہتر خیال کرنا یا کسی اچھی چیز کی تلاش و جستجو کرنا ہے۔ استحسان کی ذکر کی گئی تینوں اصطلاحی تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ اس میں انسانی مزاج، ضرورت و حاجت، کمزوریوں اور مشقتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، یعنی حرج و تنگی اور مشقت و پریشانی کے وقت اجازت و سہولت اور وسعت و گنجائش سے کام لیا جاتا ہے۔ تاکہ انسان ان کی روشنی میں اپنی زندگی اعتدال کے ساتھ گزار سکے اور احکامِ شریعت پر عمل کرنے میں حرج و تنگی اور مشقت و پریشانی محسوس نہ کرے۔ استحسان کے اُصول کی روشنی میں دو اہم عصری مسائل بیان کئے گئے ہیں:

1۔ استبدالِ وقف؛ یعنی مساجد کے علاوہ مساجد پر وقف شدہ مکان یا دُکّان کا استبدال ضرورت و مصلحت کے پیشِ نظر جائز ہے۔

2۔ زوجین میں تنسیخِ نکاح؛ یعنی خاوند اپنی بیوی پر ظلم و زیادتی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق بھی ادا نہیں کرتا اور طلاق بھی نہیں دیتا تو ایسی صورت میں عادل گواہوں کے ذریعے عدالت میں یہ سب کچھ ثابت ہو جانے کی بنیاد پر عورت کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے ضرورت و مصلحت کے پیشِ نظر دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔

نتائج بحث / سفارشات و تجاویز:

1۔ استحسان جہاں ایک لچک دار فقہ کے لئے راہ کھولتا ہے وہی اس کا غلط استعمال ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لئے بھی راہ کھولتا ہے، اس لئے اس کا متوازن اور معتدل استعمال ضروری ہے۔

2۔ چوں کہ استحسان نام ہی دلیلِ خفی کا ہے؛ اس لئے فقیہ و مجتہد کو استحسان کا اصول استعمال کرتے ہوئے قرآن حدیث میں مکمل طور پر گہری نگاہ بھی رکھنی چاہیئے۔

3۔ استحسان بالمصلحت کا استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

4۔ استحسان کے پہلو بہ پہلو سدِّ ذرائع کے اصول کو بھی مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔

5۔ موجودہ زمانے کے فقہاء و مجتہدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ مصلحت کے متعلق قواعدِ فقہیہ مرتب کریں؛ تاکہ مصلحت کا صحیح استعمال قواعد میں رہ کر کیا جاسکے۔

---

[1] متعنت باوجودِ قدرت کے بیوی کو نان ونفقہ نہ دے، اور متعسر فقر و افلاس کی وجہ سے بیوی کو نفقہ دینے پر قادر ہی نہ ہو۔

[2] تھانوی، اشرف علی، مولانا، الحیلۃ الناجزۃ، کراچی، دار الاشاعت، 1987، ص 72۔